بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقدیم

از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد' امیر تنظیم اسلامی

یہ ۴۰۔۱۹۴۱ء کی بات ہے جب میں تیسری چوتھی جماعت کا طالب علم تھا' اور ہم حصار میں ریلوے سٹیشن سے بالکل متصل اپنے اس نئے مکان میں رہائش پذیر تھے جو والد صاحب مرحوم و مغفور نے چند سال قبل ہی تعمیر کرایا تھا' کہ میرے مشاہدے میں آیا کہ دو حسین و دیدہ زیب کتابوں کے دو سیٹ ہمارے یہاں بہت اہتمام کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک سیٹ مردان خانے کی "بیٹھک" میں رکھی ہوئی میز کی دراز میں مستقلاً موجود رہتا تھا' اور دوسرا منقسم طور پر دو جز دانوں میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کے ترجمے اور حواشی والے قرآن مجید کی ان دو جلدوں (پندرہ پندرہ پاروں پر مشتمل) کے ساتھ رکھا رہتا تھا جو والدہ صاحبہ مرحومہ کے زیر تلاوت رہتی تھیں! (مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ دونوں جلدیں "متاعِ عزیز" کے طور پر اس مختصر ترین سامان کے ساتھ بھی پاکستان پہنچ گئی تھیں جس کے ساتھ ہمارے خاندان نے حصار سے سلیمانکی ہیڈ ورکس تک کا ایک سو ستر میل کا فاصلہ آگ اور خون کے دریا عبور کر کے بیس روز میں طے کیا تھا۔ پھر پاکستان میں بھی والدہ صاحبہ مرحومہ کی یہ "متاعِ عزیز" نہایت بوسیدہ ہو جانے کے باوجود کئی سال تک محفوظ رہی۔ تاآنکہ والدہ صاحبہ نے میرے مشورہ پر پچاس کی دہائی کے اوائل میں حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی والے مصحف کی تلاوت شروع کی۔)

بہرحال' متذکرہ بالا دو کتابوں کے نام تھے : تعلیم القرآن اور کلید القرآن۔ اور ان دونوں پر مصنف کا نام تحریر تھا "انیس احمد۔ بی اے (علیگ)"۔ پھر یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان ہی دنوں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ انیس احمد والدہ صاحبہ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی

ہیں۔ تاہم یہ یاد نہیں کہ میں نے کبھی ان کتابوں کو توجہ کے ساتھ پڑھا بھی ہو۔ ہائی اسکول کے زمانے میں اولاً مجھ پر "بانگِ درا" چھائی رہی' بعد ازاں کچھ حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ" اور کچھ مولانا مودودی کے ابتدائی کتابچے زیر مطالعہ رہے' اور زیادہ تر وقت مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی عملی سرگرمیوں کے نذر ہوا۔

میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران جب ذرا معلومات کا دائرہ وسیع ہوا اور حلقہ دیوبند کے بعض حضرات سے تعارف حاصل ہوا تو کان کھڑے ہوئے کہ یہ مولوی انیس احمد تو بہت بدنام انسان تھے اور ان پر حضرت شیخ الہندؒ سے غداری اور انکے خلاف مخبری کا الزام تھا۔ چنانچہ دل ہی دل میں شرم اور ندامت کا احساس بھی پیدا ہوا اور ان کے ساتھ اپنی رشتہ داری کی نسبت کو چھپائے رکھنے ہی میں عافیت محسوس ہوئی۔ بلکہ ایک واقعہ تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ یہ ۵۷۔۵۸ء کی بات ہے کہ میں اجمل باغ' رحیم آباد (ضلع رحیم یار خان) میں سردار اجمل خان لغاری مرحوم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے مولوی صاحب تشریف لائے جن کی داڑھی اور سر دونوں کے بال نہایت پراگندہ' اور کپڑے نہایت میلے اور بوسیدہ تھے' چہرے پر خشونت بلکہ وحشت تک کے آثار تھے اور ہاتھ میں ایک بہت بھاری بھرکم عصا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے شاگرد اور مصاحب رہے تھے۔ (مجھے ان کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا۔ اگرچہ بہت بعد کی بات ہے کہ ایک بار جب جناح ہال لاہور میں قرآن کانفرنس کا ایک اجلاس ہو رہا تھا' یہ اچانک "وارد" ہو گئے تھے' اور انہیں میں نے ایک مختصر سے خطاب کا موقع بھی دیا تھا!) بہرحال وہ سردار اجمل خاں صاحب مرحوم سے گفتگو کرتے رہے اور میں صرف سنتا رہا۔ لیکن اثنائے گفتگو میں ایک بار ان کی زبان پر "مولوی انیس احمد" کا نام ایسے غیظ و غضب کے ساتھ آیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں ان کا رشتہ کا بھانجا ہوں تو چشم زدن میں ان کا بھاری بھرکم عصا میرے سر پر ہو گا!

اس کے چند سالوں کے بعد مولوی انیس احمد صاحب کے ایک بھتیجے سے تعارف ہوا۔ یہ شکیل احمد قریشی مرحوم تھے' محکمہ انہار میں سپرنٹنڈنگ انجینئر' اور اس اعتبار سے نہایت مشہور اور معروف کہ گہری دینداری کے ساتھ ساتھ پورے "دیانتدار" بھی تھے اور اس

پر مستزاد یہ کہ نہایت دبنگ افسر بھی تھے اور اپنے کام میں ماہر بھی! (یہ موجودہ ماحول کے اعتبار سے "متضاد" اوصاف کسی ایک انسان میں شاذ ہی جمع ہوتے ہیں)۔ ان کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ وہ مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت ہیں تو حیرت ہوئی کہ جس حلقے کے لوگ ان کے تایا اور دادا کو انگریز کے ایجنٹ اور قوم کے غدار قرار دیتے ہیں اسی کے ایک بزرگ سے یہ کیسے بیعت ہو گئے!

تاہم اس پوری صورتحال کا "ڈراپ سین" اس صورت میں ہوا کہ جب میں ۱۹۸۰ء میں پہلی بار "بھارت" گیا اور لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے ملاقات ہوئی تو چونکہ ان کا قیام بھی بہت طویل زمانے تک بریلی میں رہا تھا جہاں مولوی انیس احمد صاحب کے والد خان بہادر مولوی ادریس احمد مرحوم محکمہ تعلیم میں بہت اونچے منصب پر فائز رہے تھے (اس صدی کی تیسری دہائی کے دور میں ان کی تنخواہ ایک ہزار روپے ماہانہ سے متجاوز تھی!) تو میں نے مولانا نعمانیؒ سے ڈرتے ڈرتے مولوی ادریس صاحب کے بارے میں دریافت کر لیا۔ اس پر مولانا نے بتایا کہ ان کے ساتھ ان کی گہری شناسائی تھی اور گھریلو مراسم بھی رہے تھے اور یہ کہ کچھ لوگوں نے ان کے بیٹے مولوی انیس احمد کو خواہ مخواہ بدنام کیا، حالانکہ اب جو انڈیا آفس کا ریکارڈ منظر عام پر آیا ہے اس سے تو معلوم ہوا ہے کہ مولوی صاحب مرحوم نہایت مخلص اور جوشیلے انقلابی کارکن تھے اور انگریز انہیں شیخ الہندؒ کے "خطرناک ترین" فدائیوں میں شمار کرتے تھے۔ اس پر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ اور میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میرے رشتے کے ماموں بفضلہٖ تعالیٰ نہ غدار تھے نہ سرکار انگریزی کے مخبر، بلکہ مخلص مومن اور مرد مجاہد تھے۔

اس کے چند سال بعد کراچی میں انیس احمدؒ صاحب کے فرزند شاہد احمد (مرحوم) سے ملاقات ہوئی (جو ایک دوسرے رشتے سے میرے خالو بھی تھے!) تو مزید معلومات حاصل ہوئیں جن سے کچھ احساس فخر بھی پیدا ہوا۔۔۔۔ خصوصاً اس بات سے کہ مولوی انیس احمدؒ بھی ان چند خوش قسمت نوجوانوں میں سے تھے جنہوں نے گریجویشن کے بعد فتح پوری مسجد دہلی میں قائم شدہ "ادارۂ نظارۃ المعارف" میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ ایسے انقلابی انسان سے قرآن پڑھا تھا اور ان ہی کی وساطت سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی مشہور

تحریک آزادی موسوم بہ "تحریک ریشمی رومال" میں شرکت کر کے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں!

البتہ جہاں تک ان کے والد مرحوم اور میری والدہ مرحومہ کے حقیقی پھوپھا یعنی خان بہادر مولوی ادریس احمد صاحب کا تعلق ہے وہ یقیناً سرسید مرحوم کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمانانِ ہند کی مصلحت اس میں سمجھتے تھے کہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روش کو ترک کر کے مصالحت کا رویہ اختیار کیا جائے' اور انگریزی زبان بھی پڑھی جائے اور جدید علوم کی بھی بھرپور طور پر تحصیل کی جائے۔ چنانچہ یہ حقیقت ان کے نام کے ساتھ ملحق خطاب سے بھی ظاہر ہے۔ تاہم ایک تو یہ ایک خاص دور کی بات ہے جس میں بہت سے عظیم المرتبت علماء بھی اس رائے کے حامل تھے۔ (جیسے مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہم اللہ!) اور دوسرے یہ کہ ایسا تو بارہا ہوا ہے کہ بیٹے نے باپ کی رائے اور روش کے بالکل برعکس راستہ اختیار کر لیا اور آزر کے گھر میں ابراہیمؑ پیدا ہو گئے۔ چنانچہ یہی صورت اس معاملے میں ہوئی!

بہرحال' اپنی اسی ملاقات میں جناب شاہد احمد صاحب نے مجھے اپنے والد مرحوم کی پیش نظر تالیف "انوار القرآن" کا ایک نہایت بوسیدہ نسخہ اپنے تحریر کردہ "تعارف" کے ساتھ عنایت فرمایا تھا جسے ایک "تبرکِ علمی" کی حیثیت سے شائع کرنے کا فیصلہ تو اگرچہ میں نے اسی وقت کر لیا تھا' تاہم دیگر دعوتی و تنظیمی مصروفیات کی وجہ سے' جن میں گزشتہ دس پندرہ سالوں کے دوران بیرونی اسفار نے زیادہ ہی شدت پیدا کر دی ہے' یہ کام مؤخر ہوتا رہا۔ تاآنکہ "کلّ امرٍ مرھونٌ لوقتہٖ" کے مطابق مشیتِ ایزدی میں اس کی اشاعت کا وقت آ گیا۔ چنانچہ اب یہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس تحریر کا اقتباس بھی پیش کر دوں جو میں نے ۱۹۸۷ء میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ عبد الحئی فاروقیؒ کی تالیف "الخلافۃ الکبریٰ" کا مقدمہ ماہنامہ "میثاق" میں شائع کرتے ہوئے اس کے تعارف کے ضمن میں سپردِ قلم کی تھی :

"اس تبرکِ علمی و دینی کے تعارف کا ایک دوسرا رخ بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کا تعلق علم و تفسیرِ قرآن کے اس "انقلابی" مزاج کے حامل سلسلے سے ہے جو اس صدی کے اوائل میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی ذاتِ بابرکات سے شروع ہوا تھا' جن کے خلیفۂ اول کی حیثیت حاصل تھی مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو جو اواخر عمر میں کچھ زیادہ ہی "انقلابی" ہو گئے تھے' اور خلیفۂ ثانی کا درجہ حاصل تھا مولانا احمد علی لاہوریؒ کو جو عمر کے آخری دور میں اغلباً اعوان و انصار کی کمی اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انقلابیت سے کسی قدر رجعت فرما کر روحانیت اور بیعتِ ارشاد میں منہمک ہو گئے تھے اور تیسری اہم شخصیت تھی خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کی جو اغلباً از اول تا آخر معتدل مزاج کے حامل رہے اور ان کے انقلابی فکرِ قرآنی نے نہ تو کوئی بڑی زقند لگائی اور نہ کسی درجے میں رجعت ہی اختیار کی!

راقم نے آج سے ٹھیک دو سال قبل "میثاق" بابت دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک طویل مضمون میں تفسیر قرآن کی ان مختلف شاخوں کا جائزہ لیا تھا جو برعظیم پاک و ہند میں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل میں پھلی پھولیں۔ (یہ تحریر اب راقم کی تالیف "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل ہے!) ان میں قادیانی و لاہوری سلسلے سے قطع نظر جو "ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِیۡدًا" کا مصداقِ کامل بن گیا' ایک انتہا پر تو متجددین کا سلسلہ تھا جس کے بانی مبانی تھے سرسید مرحوم اور ان کے اہم خلفاء میں شامل ہیں علامہ عنایت اللہ خان مشرقی اور چوہدری غلام احمد پرویز' اور دوسری انتہا پر تھے "الرَّاسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ" جن کے سید الطائفہ تھے حضرت شیخ الہندؒ۔ اور ان کے مابین تھیں تین درمیانی رنگ کی حامل شاخیں جو ---- مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا حمید الدین فراہی اور علامہ اقبال سے شروع ہوئیں اور جن کے خلفاءِ عظام ہیں علی الترتیب مولانا مودودی' مولانا اصلاحی اور ڈاکٹر رفیع الدین۔ علماءِ راسخین کے حلقے کی دوسری اہم شخصیت ہیں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ جن کے بارے میں راقم لکھ چکا ہے کہ ان کی تفسیر بیان القرآن سے تین تفسیریں مزید نکلی ہیں' ایک مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم کی' دوسری مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی اور تیسری مفتی محمد شفیعؒ کی۔ البتہ خاص حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ بابرکات سے تفسیر قرآن کے جو دو چشمے پھوٹے ان میں سے متذکرہ بالا تحریر میں صرف ایک کا ذکر ہوا تھا

یعنی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حد درجہ سلیس لیکن انتہائی عمیق حواشی کا۔ لیکن دوسرے اہم سلسلے کا ذکر رہ گیا تھا جس کے اہم افراد ہیں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم' مولانا احمد علی لاہوریؒ اور خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ"۔"

پیش نظر کتاب کی اشاعت کے ذریعے' ان شاء اللہ العزیز' اس "سلسلة الذهب" کی ایک تیسری کڑی کا ذکر بھی تاریخ کے صفحات میں مذکور و محفوظ ہو جائے گا۔

مولوی انیس احمدؒ کے بڑے بیٹے نفیس احمد مرحوم تو میری معلومات کی حد تک لاولد ہی فوت ہو گئے تھے۔ البتہ ان کے چھوٹے بیٹے شاہد احمد مرحوم کی اولاد بحمد اللہ پاکستان میں موجود ہے اور سب بہن بھائی بحمد اللہ ذہانت و فطانت میں تو اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ان سب کو اپنے جدِّ امجد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آمین!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور' ۵۔جون ۱۹۹۶ء

تعارف

یہ کتاب "انوار القرآن" والد صاحب مرحوم و مغفور نے غالباً ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں تصنیف کی۔ اس سے پہلے بھی ان کی دو کتابیں آرٹ پیپر پر شائع ہوئیں جن کے نام تھے "تعلیم القرآن" اور "کلید قرآن"۔ آخر الذکر کتاب انہوں نے دوبارہ شائع کرنے کے لئے شیخ محمد اشرف صاحب کو دی تھی جو لاہور کے بڑے پبلشر ہیں۔ لیکن چونکہ مولانا موصوف پر انگریز دشمنی کا لیبل لگا ہوا تھا لہٰذا انہوں نے اس کو شائع نہیں کیا۔ اس کی آخری کاپی ضرور ان کے مطبع کے ریکارڈ میں ہو گی۔

والد صاحب مرحوم بڑے روشن خیال عالم تھے اور بڑے پکے موحد اور مجاہد۔ انہوں نے دنیاوی منفعت اور آسائش کو کبھی کوئی حیثیت نہیں دی۔ جہاں تک مجھے اُن سے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ ۱۹۱۲ء میں جب ایم اے او کالج علی گڑھ سے انہوں نے بی اے بڑے امتیاز سے پاس کیا تو ان کو ڈپٹی کلکٹری کا پروانہ انگریزوں نے عطا کیا۔ لیکن ان کو جذبہ دینی اور جذبہ جہاد نے گھر سے جانے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت تک اُن کی تین اولادیں ہو چکی تھیں۔ ان کی والدہ محترمہ نے ان کو زادِ راہ کے لئے اپنا سارا زیور دے دیا اور وہ خاموشی سے دہلی چلے گئے۔ وہاں مولانا عبید اللہ سندھی صاحب نے ادارہ نظارۃ المعارف فتح پوری مسجد میں بنایا تھا جہاں وہ صرف گریجویٹ طلبہ کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ وہاں سے بہت جلد وہ فارغ ہوئے اور مولانا عبید اللہ نے اپنی خصوصی سند کے ساتھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے پاس دیوبند بھیج دیا۔ حضرت شیخ الہند نے ایک سال سے کم عرصے میں اُن کو سند تبلیغ قرآن اور علومِ دین عطا فرمائی۔

حضرت موصوف کی تحریک، جسے انگریز ریشمی رومال کی سازش یا بغاوت کہتے ہیں، شروع ہوئی تو وہ اولین ساتھیوں میں سے تھے۔ تحریک کی تنظیم حیدر آباد دکن ان کے